ISSN Online : 2709-4162
ISSN Print : 2709-4154
Volume.6, Issue.3 (2023)
(July-September)

A Study of Resistance in Irfan Ahmed Urfi's Short Stories

عرفان احمد عرفی کے افسانوں میں مزاحمت نگاری: ایک مطالعہ

Rizwana Bibi
Itrat Batool
Scholar PhD (Urdu), SUIT, Peshawar at-Rizwana.phd289@gmail.com
Instructor, Department of Urdu, Rawalpindi Campus, VUP at-itrat.batool@vu.edu.pk

Abstract
Where the invasion of scientific inventions has eased the problems of man, it has introduced new problems as well. The problems of the modern age are also of a new type. These problems are not only limited to the identity crisis of the individual but also include the problems arising under the modern industrial system. Current affairs and contemporary issues have always been made a subject in Urdu fiction. However, the problems of the modern age are such a critical that every fiction writer cannot afford to subject them in writing. Manto and Asmat took in their fictions the critical issues of their era. On the one hand, they had to face resistance by readers and writers due to the violation of traditional themes. On the other hand, they themselves emerged as prominent names of resistance against social problems. In the present era, the example of Irfan Ahmad Urfi can also be taken so. He is not so prominent in the contemporary Urdu fiction scene because the reader has no insight to afford a second recitation after reading his short stories. His fiction is an open resistance against the evils of the modern age. In the article under review, an attempt has been made to present some colors of this resistance from his short stories.

Keywords: scientific inventions, Industrial System, Irfan Ahmed Urfi, Manto, Ismat, Resistance

ملخص:

سائنسی ایجادات کی یلغار نے جہاں انسان کی مشکلات آسان کی ہیں وہیں انسان کو نت نئے مسائل سے بھی آشنا کیا ہے۔ جدید عہد کے مسائل بھی نئی طرز کے ہیں۔ یہ مسائل صرف فرد کے شناختی بحران تک ہی محدود نہیں بلکہ اس میں جدید صنعتی نظام کے تحت جنم لینے والے مسائل بھی شامل ہیں۔ اردو افسانے میں حالات حاضرہ اور معاصر مسائل کو ہمیشہ سے ہی موضوع بنایا گیا ہے۔ تاہم عہد جدید کے مسائل اتنے نازک ہیں کہ ہر افسانہ نگار انہیں اپنے افسانے میں برتنے کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ اپنے عہد کے جن نازک مسائل کو منٹو اور عصمت نے اپنے افسانوں میں برتا تو ایک طرف انہیں روایتی موضوعات کی خلاف ورزی کی بنا پر مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ جبکہ دوسری طرف وہ خود معاشرتی مسائل کے خلاف مزاحمت کا نمایاں نام بن کر ابھرے۔ عہد حاضر میں عرفان احمد عرفی کی مثال بھی اسی ذیل میں لی جا سکتی ہے۔ اردو کے معاصر افسانوی منظر نامے میں وہ پورے قد کے ساتھ سامنے نہیں آتے کیونکہ قاری انہیں پڑھ کر دوسری قرات کا متحمل نہیں ہوتا۔ ان کے افسانے عہد جدید کی خرابات کے خلاف کھلی مزاحمت ہیں۔ زیر نظر مقالے میں ان کے افسانوں میں سے اس مزاحمت کے چند رنگ پیش کرنے کی سعی کی گئی ہے۔

کلیدی الفاظ: سائنسی ایجادات، صنعتی نظام، عرفان احمد عرفی، منٹو، عصمت، مزاحمت

عرفان احمد عرفی افسانے کی دنیا کا نمایاں نام ہے۔ وہ اپنے آپ میں مگن رہنے والے افسانہ نگار ہیں۔ عرفان احمد عرفی نہ صرف افسانہ لکھتے ہیں بلکہ ڈرامہ نگار بھی ہیں۔ انہوں نے خود بھی ڈراموں میں کام کیا اور بہت اچھے رقاص بھی ہیں۔ تاہم اپنے مزاج اور اسلوب کی وجہ سے ادبی دنیا میں بالکل الگ پہچان رکھتے ہیں۔ ''پاؤں'' عرفی کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ہے

ISSN Online : 2709-4162
ISSN Print : 2709-4154
Volume.6, Issue.3 (2023)
(July-September)

جس میں گیارہ افسانے شامل ہیں۔ زمانی اعتبار سے عرفی نئے افسانہ نگار نہیں ہیں بلکہ کئی برسوں سے ادبی جرائد میں ان کے افسانے چھپ کر شناخت بنا چکے ہیں۔ یہ الگ بات کہ دیگر شعبوں میں مصروفیات کی وجہ سے اپنے افسانے مجتمع کرنے میں انہیں تاخیر ہوئی لیکن تاخیر سے سہی، اب یہ افسانے چھپے ہیں تو ادبی حلقوں میں انہیں بہت توجہ سے دیکھا جا رہا ہے۔ ان کے ہاں زبان کا ایک خاص ذائقہ ملتا ہے اور وہ جنس اور تشدد کے ایسے موضوعات کو بھی بہ سہولت لکھ لیتے ہیں جن پر لکھنے کا رواج اردو میں بہت کم رہا ہے۔ ان کے افسانے عمدہ، تازہ اور موثر بیانیے کے حامل ہیں۔ ان کا دوسرا افسانوی مجموعہ "کنٹرول روم" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ عرفی کے فن کی بابت راشد محمود ار قم لکھتے ہیں:

"عرفی لکھتا ہے اور اپنا کتھارسس کرتا ہے۔ وہ خود کو کتھارتا ہے اور دوسروں کو نتھارتا ہے۔ عرفی افسانہ نگار بھی ہے اور جنس کا شکار بھی۔ اسے پڑھ کر لگتا ہے کہ وہ کسی کی تلاش میں ہے۔ وہ کسی کو ڈھونڈ رہا ہے، گویا کوئی بادیہ نشین ہے جو بہت پیاسا ہے اور کسی کو مدد کے لیے پکار رہا ہے۔ لیکن اس کی یہ پکار صدا بہ صحرا ثابت ہوتی ہے۔ پھر جب اسے کوئی جواب نہیں ملتا تو وہ خود کو بے یار و مددگار سمجھ کر خوف سے روتا بھی ہے۔ یا پھر وہ کوئی معصوم سی جان ہے جو مامتا کی ماری ہے۔۔۔ اس کے افسانوں سے چھن چھن کی آوازیں آتی ہیں جیسے طوائف کے کوٹھوں کے دریچوں سے آتی ہیں۔ جنھیں سن کر راہ گزر نظریں اوپر اٹھا کر دیکھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔"(۱)

درج بالا حوالے سے ظاہر ہوتا ہے کہ عرفی کی سوچ سطحی نہیں بلکہ بہت گہری ہے اور اسی سوچ کی مدد سے وہ معاشرے کے اس روزن سے بھی جھانک لیتے ہیں جہاں تک عام آدمی کی رسائی نہیں ہوتی۔ وہ ان خفتہ سوراخوں کے پیچھے پنپتی زندگی کو اپنی کہانی کی بنیاد بناتے ہیں اور ان کے افسانوں میں کسی مخصوص طبقے کی نہیں بلکہ ہر طبقے کی تصویر نظر آتی ہے۔ عرفان احمد عرفی کے افسانوں میں جدید معاشرے کا موضوع عام ملتا ہے۔ دور جدید میں بہت سے عوامل کے نتیجے میں متعدد سماجی و معاشرتی تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں جنہیں ثقافتی تغیر سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ قدیم سماجی ڈھانچہ، معاشرتی اقدار، خاندانی نظام اور سماجی ادارے شکست و ریخت کا شکار ہیں اور ان کی جگہ نیا سماجی ڈھانچہ، اقدار اور ادارے بن رہے ہیں۔ عرفی کے افسانوں میں اس معاشرتی جدت کو کھل کر موضوع بنایا گیا ہے۔ انہوں نے جدید معاشرے کی خصوصیات پر کسی قسم کا پردہ نہیں ڈالا اور جدت کی آڑ میں درپیش مسائل کو واضح طور پر بیان کیا ہے۔ مثال کے طور پر ان کے افسانے "نوٹنکی" میں جدید معاشرت کی جھلک دیکھیں:

"غصے میں بپھری عورت اینکر پرسن کو نفرت سے دیکھتی ہوئی اس کے برابر بیٹھے مہمانِ خصوصی کو اوٹ میں سے نکالنے کے لیے لپکتی ہے جو گیٹ اپ سے انیس بیس گریڈ کا سرکاری ملازم نظر آ رہا ہے۔

"مجھے پہلے ہی شک تھا تم اسی حرافہ کے ساتھ یہاں آئے ہو گے۔ اب تم یہی کہو گے کہ میرا اس کا ورکنگ ریلیشن شپ ہے۔" دیہاتی لہجے میں بپھرتی بیوی سے رنگے ہاتھوں پکڑے جانے پر بیوروکریٹ سہم جاتا ہے۔۔۔

"تو یہ ہے آپ کی فرسٹ کزن جو آپ کی بیگم بھی ہے سر۔۔۔؟ اینکر پرسن ڈپٹی سیکرٹری نما اپنے بوائے فرینڈ سے مخاطب ہے۔ "آپ کا تو دعویٰ تھا کہ آپ کے خاندان کی ہر عورت ورلڈ کلاس سکولنگ کی پروڈکٹ ہے۔۔؟"

"سکولنگ سے بیک گراؤنڈ نہیں۔۔۔ فور گراؤنڈ بدلتا ہے میڈم۔"(۲)

گویا بیک گراؤنڈ اس قدر ناگوار عنصر ہے کہ جس کو بدلنا ہی مقصود ٹھہرا اور پھر یہ افسوس کہ اعلیٰ تعلیم کے باوجود فرسودہ بیک گراؤنڈ ماڈرن نہیں ہو پاتا۔ دراصل ہمارے معاشرے میں خاندان میں شادی کا رواج ہے اور مرد چاہے کسی بھی مقام پر پہنچ جائے اس کی شادی خاندان میں ہی کرنے کو ترجیح دی جاتی ہے۔ دیہات سے تعلق رکھنے والے امراء، وڈیروں اور افسران کی کی خاندانی بیویاں بھی دیہاتی ہوتی ہیں جیسا کہ درج بالا حوالے سے ظاہر ہے۔ دیہاتی عورت اپنے مرد کے معاملے میں خاصی جذباتی ہوتی ہے لیکن جب ان جذبات کا مظاہرہ شہری ماحول میں کیا جاتا ہے تو اسے فرسودگی اور اجڈ پن سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ حالانکہ مرد اگر شستہ نباہنے میں اخلاص کا مظاہرہ کرے تو یہ نوبت ہی نہ آئے۔ ایسے معاملات میں تعلیم کو تو خواہ مخواہ بدنام کیا جاتا ہے۔ دراصل عالمگیری مقصدِ تعلیم بھی یہی سامنے آتا ہے کہ زندگی سے جذبات کو خارج کر کے صرف دو جمع دو چار کے

ISSN Online : 2709-4162
ISSN Print : 2709-4154
Volume.6, Issue.3 (2023)
(July-September)

معاملات پر غور کیا جائے اور ترقی کے نام پر شخصی آزادی کی کوئی حد نہ رکھی جائے۔ عرفی نے مذکور بالا افسانے میں اسی المیے کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ترقی یافتہ زندگی کی ذیل میں عرفان عرفی کے افسانہ "بن بڈھا" میں لندن زدہ زندگی کا بیان ملاحظہ ہو:

"بہت سال پہلے لندن کے ایک معتبر سکول کی روش پر شدید جاڑوں کی دھند میں اگر جوانی اس کے ساتھ اتنے آتشیں دھماکے کے ساتھ نہ ٹکراتی تو ممکن تھا وہ ڈگری مکمل ہی کر لیتی۔

"تم سے اپنی لولائف بیان کرتے ہوئے میں کبھی ہچکچائی نہیں حالانکہ تم اندر سے جتنی بڑی نچ ہو میرے لیے محتاط رہنا ہی بہتر ہے۔" اس بات پر ہم دونوں زور دار قہقہہ لگاتے اور بعض اوقات آپس میں اپنے ہاتھ بھی ٹکراتے جن کی رگڑ سے کبھی بجلی نہ نکلتی۔۔"(۳)

لندن کی تعلیم ہی ایک معیار ہے کہ جو جدید معاشرت میں کامیاب زندگی کی علامت ہے اور یہ کامیابی کرداروں کی زبان میں رچ بس گئی ہے۔ "نچ" کا لفظ روزمرہ گفتگو میں شامل ہونا لندن کے معتبر اسکول کی اسکولنگ کی خوب عکاسی کر رہا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ تعلیمی نظریات اور تعلیمی اقدار بدل رہی ہیں اور اس حوالے سے ترقی یافتہ ممالک کی ترقی پذیر ممالک پر برتری کو واضح طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔ فرسودہ طریق ہائے تعلیم کی جگہ جدید تعلیم رائج ہو رہی ہے اور عالمگیریت نے جدید تعلیم کو ہی کامیابی کی ضمانت قرار دیا ہے۔ اس حوالے سے عرفان عرفی کے ہاں تعلیم میں جدت کی مثال دیکھیں:

"تجویز کیا جاتا ہے کہ ڈبلیو ڈبلیو ڈبلیو ڈاٹ ہکڈ آن فونکس ڈاٹ کام پر جا کر سوچے سمجھے بغیر لفظوں کو پہچاننے کی صلاحیتیں بڑھانے کی ایوارڈ یافتہ مشقیں ڈاؤن لوڈ کی جائیں تو بہتری کا امکان ہے۔۔ری سٹارٹ۔۔سٹینڈ بائے۔۔شٹ ڈاؤن۔۔"(۴)

جہاں تک تعلیم میں جدت کا تعلق ہے تو اسے ایک مثبت تبدیلی قرار دیا جا سکتا ہے۔ لیکن دیگر شعبہ ہائے زندگی میں عالمگیریت کے اثرات اس اعتبار سے قابلِ تحسین نہیں کہ اس طرح ایک مقامی ثقافت نہ تو اپنی بنیادوں کی پیروی کے قابل رہتی ہے اور نہ ہی اس کی اتنی استعداد ہوتی ہے کہ وہ نئی ثقافت کو من و عن اپنے اندر جگہ دے سکے۔ ایسے میں وہی معاملہ آن ٹھہرتا ہے کہ کوا میاں ہنس کی چال چلتے ہوئے اپنی چال بھی بھول جاتا ہے۔ مغربی ثقافت نے ایسا ہی کچھ حال ہماری ثقافت کا بھی کر ڈالا ہے۔ عرفان عرفی کے ہاں مغربی ثقافت کی یلغار "چھت" کے زیرِ عنوان تحریر کے اس اقتباس میں ملاحظہ ہو:

"رات گئے مارکیٹوں کے جلتے بجھتے کونے پہلے سے بھی زیادہ پر رونق ہو چکے تھے۔ جو کبھی توے پر برگر فرائی کرتے تھے اب پلازے میں فوڈ کی ٹیک اوے ونڈو کھولے بیٹھے تھے اور فاسٹ فوڈ چلا رہے تھے۔۔۔جو سامنے پزا ہاؤس کی میڈم ہے جی۔۔۔سر جی اس پزا ہاؤس میں بہت گورا آتا ہے۔ سنا ہے جی وہ گورا لوگ بہت ٹپ دیتے ہیں جسے ہم گورا اِپ کہتے ہیں۔ بعض اوقات وہ اپنی کرنسی میں بھی بخشیش دے دیتے ہیں۔"(۵)

برگر کلچر عالمگیریت کا خصوصی تحفہ ہے جو برصغیر کے حصے میں آیا ہے۔ عالمگیری اثرات کے تحت کھانے پینے کے آداب میں بھی بڑا تغیر رونما ہو چکا ہے۔ گھر سے باہر کھانا کھانا جو کبھی ایک بہت نامناسب فعل سمجھا جاتا تھا، اب ایک تفریحی صنعت بن چکا ہے اور بہت سے شہروں میں کثیر تعداد میں فیملی ریسٹورنٹ کھل چکے ہیں۔ اندازِ بعام کی تبدیلی تو پھر اتنی ناگوار نہیں لیکن انگریزی کلچر نے ہماری ثقافت کی تمام اقدار کو مسخ کر دیا ہے۔ جنسی آسودگی کے لیے مغربی معاشرت میں مخصوص کھلونوں کا استعمال اب ہماری مقامی زندگیوں میں بھی جگہ پانے لگا ہے۔ عرفان عرفی کے ہاں اس کی مثال ملاحظہ ہو:

"۔۔۔جو سٹفڈ ٹیڈی بیئر میرے ساتھ بستر میں جانے کو تیار تھا اسے ٹٹولنے کا سنسنی خیز خیال مجھے زیادہ ہانٹ کر رہا تھا۔"(۶)

اب اس سے بڑھ کر ستم ظریفی کیا ہو گی کہ حیا کے دین کے نام پر بننے والی ریاست کے افراد نفس کے ہاتھوں بے بس ہو چلے ہیں۔ اس کے علاوہ نوجوان نسل میں لوافیئر کا رجحان عام ہو رہا ہے جس کا منفی پہلو یہ ہے کہ جذبات کی رو میں بہک کر لڑکا اور لڑکی اپنی حدود سے تجاوز کر جاتے ہیں جس کا نتیجہ دونوں ہی کے لئے پشیمانی کے سوا اور کچھ نہیں

ISSN Online : 2709-4162
ISSN Print : 2709-4154
Volume.6, Issue.3 (2023)
(July-September)

نکلتا۔ دونوں ہی اپنی عفت و عصمت کے اس گوہر نایاب سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں جس کی حفاظت ان کا مذہبی اور اخلاقی فریضہ ہے۔ لیکن عالمگیریت نے شخصی آزادی کا اس قدر پرچار کیا ہے کہ اب یہ باتیں معمول لگنے لگی ہیں۔ عرفی کے ہاں جنس کے موضوع کو باریک بینی سے افسانے میں بنا گیا ہے۔ بلاشبہ عرفی نے نہایت فنکاری سے انتہائی نازک مسائل و موضوعات کو جس طرح قاری کے حوالے کیا ہے وہ دیگر مصنفین کے معمول میں نہیں۔

عالمگیریت کی بدولت اردو افسانے میں موضوعات کا جو تنوع دیکھنے میں آیا ہے اس میں ایک موضوع جنس بھی ہے۔ جدید افسانے میں جنس کے روایتی مسائل سے ہٹ کر نئے زاویوں کو موضوع بنایا گیا ہے۔ یہ ایسے موضوعات ہیں جن کا تعلق ہمارے معاشرے سے میل نہیں کھاتا لیکن میڈیا کے توسط سے ان موضوعات کو جدت اور آزادی کا لباس پہنا کر رائج کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ اس ذیل میں عرفان احمد عرفی کے افسانے "ماسکیٹو کوائل" سے ایک آزاد خیال ملاحظہ ہو:

"ازہی بگ؟" جواب سننے کے لیے میرے دل کی دھڑکن بھی تیز ہو گئی۔

"تمہارے منہ میں کیوں پانی بھر آیا؟ سائز میرا مسئلہ نہیں ہے۔ یو آر آلویز گو فار سائز۔ شیلو لور۔ خیر تم یقین نہیں کرو گے وہ جب بیڈ میں ہوتا ہے تو واقعی مانسٹر ہوتا ہے۔۔۔ اوہ مائی گاڈ"(۷)

درج بالا حوالہ عرفان احمد عرفی کے افسانے کی ایک شادی شدہ عورت کے معاشقے کا بیان ہے جس کا ذکر مذکورہ عورت بڑے دھڑلے سے اپنی سہیلی سے کرتی ہے۔ خاتونِ مذکور اپنے بچوں کو ان کی پھپھو کے گھر بھیج کر بہت آرام سے اپنی جنسی تشفی کے لیے غیر مرد کو گھر بلا لیتی ہے اور ستم یہ کہ یہ مرد جنسی فعل کی سرزدگی کے بعد اس عورت کے گھر میں ننگا گھومتا ہوا دکھایا گیا ہے یہاں تک کہ گھر کی سوئی ہوئی ملازمہ ایک دم جاد جاتی ہے اور گھر میں دندناتے اس ننگے مرد کو دیکھ کر خوف سے چیخ اٹھتی ہے۔ ستم بالائے ستم کہ گھر کی مالکن کے لیے یہ صورتِ حال لطف اور حظ کا باعث بنتی ہے۔ پرانے افسانے میں بھی جنسی روابط کی بے ضابطگیوں کو بڑے پیمانے پر موضوع بنایا گیا ہے لیکن جدید افسانے کی درج بالا مثال میں تمام پردے پھاڑ کر انسانیت کو جس طرح ننگا کر کے دکھایا گیا ہے وہ یقینی طور پر میڈیا کی بے باکی کا شاخسانہ ہے جس کی بدولت آج کا قاری صرف قاری نہیں بلکہ ان ننگے مناظر کا ناظر بھی ہے اس لیے ایسے موضوعات اب اچھنبے کا باعث نہیں بنتے۔ عرفان احمد عرفی کے افسانوں میں صرف مخالف جنس ہی نہیں بلکہ ہم جنس پرستی کے موضوع کو بھی اجاگر کیا گیا ہے۔ اس ضمن میں ان کے افسانے "ایکسٹیسی" سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

"رات بہت گہری تھی، ساری مارکیٹ بجھ چکی تھی۔۔۔ تھکے ہارے لڑکے نڈھال جسموں کے ساتھ۔۔۔ کچرا ڈرموں میں پھینک رہے تھے۔ حالانکہ میرا ارادہ پارکنگ میں رکنے کا نہیں تھا۔۔۔ اسی لیے میں نے کار کی رفتار کم نہیں کی تھی۔۔ اچانک مجھے دور اندھیرے میں وہ جاتا دکھائی دیا یا پھر کوئی اور اس جیسا تھا۔ اس دم وہ بہت سال پہلے کا لگ رہا تھا، اتنا ہی چھریرہ، تروتازہ اور رس بھرا۔۔ میری نظریں اس پر گڑی رہ گئیں۔ میں اسے روکنا چاہتا تھا۔۔۔ جانے کیوں میرے جی میں آئی میرا بازو اتنا لمبا ہو جائے کہ وہیں سے اسے جھپٹ لوں۔۔۔ جی میں آئی میں اسے ایک ہی لقمے میں نگل لوں۔ میرے بازوؤں میں جیسے کنگ کانگ نما مخلوق کا ہاتھ اگ آیا تھا جو آپ ہی آپ میرے لوَمسل کو مسلنے لگا۔۔۔ میرا حجم کسی دیوہیکل مخلوق کی طرح بڑھتا چلا جارہا تھا اور کپڑے تنگ ہو کر پھٹنے لگے تھے۔۔۔"(۸)

درج بالا حوالہ اردو افسانے کی اس کروٹ کو ظاہر کر رہا ہے جو بہر حال ایک حساس قاری کے لیے پسندیدہ نہیں۔ لیکن حقیقت یہی ہے کہ پوری دنیا میں بالعموم اور پاکستان میں بالخصوص میڈیائی عناصر جیسے شوبزنس یعنی ماڈلنگ، ٹی وی اور فلموں نے ہم جنس پرستی کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ میڈیا کی بے لگام آزادی اور انٹرنیٹ کے غیر منضبط استعمال نے ہم جنس پرستی کی طرف مائل لوگوں کو اس دلدل میں مزید دھنسنے کے سارے مواقع نہایت آسان طریق پر بہم پہنچا دیئے۔ شوبزنس نے ایسے لوگوں کو بھی ہم جنس پرستی کی لعنت میں دھکیل دیا جو کہ اس طرف کوئی ذہنی و فطری میلان نہ رکھتے تھے اور عام الفاظ میں نارمل انسان ہوتے ہیں۔ شوبزنس کی چکاچوند زندگی سے متاثر ہو کر چھوٹے بڑے شہروں سے خوش شکل لڑکے اس دنیا کا رخ کرتے ہیں اور وہاں اس قبیح فعل کا شکار ہوتے ہیں جس کو شوبزنس کی زبان میں "کاسٹنگ کاؤچ" کہا جاتا ہے۔ کاسٹنگ

ISSN Online : 2709-4162
ISSN Print : 2709-4154
Volume.6, Issue.3 (2023)
(July-September)

کاؤچ کا مطلب ہے کہ میڈیا کی دنیا میں بااختیار حیثیت رکھنے والے لوگ جو کہ عموماً پروڈیوسر، ڈائریکٹر اور ماڈل کو آرڈی نیٹر وغیرہ ہوتے ہیں، ماڈلنگ اور ایکٹنگ کے شوقین نئے آنے والے لڑکوں کو ڈرامے، فلمیں اور کمرشلز وغیرہ دلوانے کی لالچ دے کر ان کو خود کے ساتھ جسمانی تعلقات استوار کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ کاسٹنگ کاؤچ کی اصطلاح ہی یہاں سے آئی ہے یعنی کاسٹنگ ڈائریکٹر کے ساتھ کاسٹنگ روم کے کاؤچ یعنی صوفے پر جنسی تعلقات استوار کرنا۔(۹)

افسانہ نگار اس مذموم فعل پر کہانی لکھ کے عوام کو معاشرے کی اصل تصویر دکھانے کی سعی کرتے ہیں لیکن یہاں ان پر یہ حد بھی عائد ہوتی ہے کہ وہ کہانی کو اس پہلو سے لکھیں جس سے قاری ان نازک معاملات کو سمجھ سکے نہ کہ ان کی طرف راغب ہو جائے۔ یہی نہیں بلکہ اردو افسانے میں اب جنسی تشفی کے لیے مارکیٹ میں دستیاب سٹفڈ کھلونوں کا ذکر بھی ملنے لگا ہے اور ہمارے معاشرے کو جنسی آسودگی کا یہ سامان بھی مغرب سے ہی تحفے میں ملا ہے۔ عرفان احمد عرفی کے افسانے "جگہ" سے ایک زاویہ ملاحظہ ہو:

"۔۔۔جو اسٹفڈ ٹیڈی بیئر میرے ساتھ بستر میں جانے کو دستیاب تھا اسے ٹٹولنے کا سنسنی خیز خیال مجھے زیادہ ہانٹ کر رہا تھا۔"(۱۰)

مغربی ممالک میں تو پھر میڈیا اور ٹیکنالوجی اس قدر آزاد ہے کہ وہاں ہر کام کی آزادی ہے لیکن حیرت کی بات ہے کہ پاکستان جیسے پسماندہ ملک کے کئی شہروں میں خفیہ طور پر جنسی کھلونے بنانے کے کارخانے چل رہے ہیں۔ بظاہر ہمارے معاشرے میں جنس سے متعلق ایسے موضوعات یا اشیاء کو ممنوع قرار دیا جاتا ہے جن کی اجازت ہمارے مذہب میں نہ ہو۔ ایسے میں یہ بات بہت ہی حیران کن ہے کہ پاکستان میں بڑے پیمانے پر سیکس ٹوائز یا جنسی کھلونے بنانے کا کام ہو رہا ہے اور یہ انڈسٹری اربوں روپے کما رہی ہے۔ جنسی کھلونے یا سیکس ٹوائز سے مراد وہ آلات یا مشینیں ہیں جو جنسی آسودگی کو بڑھانے یا کم از کم جنسی عمل میں کسی فرد کے لئے مدد و معاون ہوتی ہیں۔ ان کی بہت سی قسمیں ہیں جس میں خواتین و مردوں کے لئے علیحدہ علیحدہ مصنوعات ہیں۔

دی اکانومسٹ کی رپورٹ کے مطابق لاہور شہر سے لے کر کراچی اور دیگر بڑے شہروں میں یہ کام چوری چھپے جاری ہے کیوں کہ سیکس ٹوائز بنانا یا بیچنا پاکستان میں جرم ہے۔ خبر میں انکشاف کیا گیا ہے کہ پاکستان میں خواتین کے استعمال کے لئے سب سے زیادہ سیکس ٹوائز بنتے ہیں۔ ان میں سٹیل سے بنی مصنوعات شامل ہیں جن میں مردانہ اعضا مخصوصہ کا سانچہ سٹیل کے ذریعے بنایا جاتا ہے۔ دوسری جانب مرد حضرات کے لئے بھی زنانہ اعضائے مخصوصہ بھی ان مصنوعات میں شامل ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ جنسی اختلاط کے حوالے سے مقام ممنوعہ کی تسکین کے لئے مخصوص مصنوعات کی ڈیمانڈ بھی زیادہ ہے۔(۱۱)

جنسی آسودگی کے مصنوعی آلات کی ترویج میں سوشل میڈیا پر آجانے والے وہ اشتہارات بہت اہم کردار ادا کرتے ہیں جو صارف کی مرضی کے بغیر سامنے آجاتے ہیں۔ دو بڑے سوشل میڈیا پلیٹ فارمز فیس بک، یوٹیوب کے علاوہ دیگر ویب سائٹس اور نیٹ ورکس پر اس قسم کے فحش ترین اشتہارات کی بھرمار ہے۔ مختلف تجارتی ادارے ان سوشل میڈیا ویب سائٹس کو رقم ادا کر کے اپنے اشتہارات دیتے ہیں اور صارف کو اپنی مصنوعات کی آن لائن خریداری کی طرف راغب کرتے ہیں۔ میڈیا پر جنسی کھلونوں کے اشتہارات کی بہتات ہے۔

ایک رپورٹ کے مطابق ایک افریقی ملک نے باقاعدہ اس حوالے سے قانون سازی کی ہے۔ کیونکہ ان کے ہاں یہ کھلونے اس قدر مقبول ہو چکے ہیں کہ کوئی بھی نوجوان شادی کرنے کو تیار نہیں یا شاید قابل نہیں۔(۱۲)

یہ جنسی کھلونے اب باآسانی دستیاب ہیں اور اکثر اشتہارات ہی ان کے ہوتے ہیں۔ میڈیا پر ان کی واضح اور نمایاں تصاویر کے ساتھ اشتہارات دیئے جاتے ہیں۔ اس بات سے کوئی بھی باشعور انسان اندازہ کر سکتا ہے کہ اس رجحان کے معاشرے پر کیا اثرات مرتب ہو سکتے ہیں۔ اس ضمن میں ایک طرف تو والدین اور اساتذہ کو سوشل میڈیا کے غلط استعمال کی باریکیوں کی بابت آگاہی مہم میں حصہ لینا ضروری ہے تاکہ وہ اپنی اولاد اور شاگردوں کی تربیت میں اس اہم مگر بڑی حد تک نظرانداز معاملے پر مناسب توجہ دے سکیں۔ دوسری طرف ادب کے ادارے پر بھی یہ ذمہ داری عائد نظر آتی ہے کہ ان اہم، نازک اور سنگین مسائل کو ادب میں اس طرح جگہ دی جائے کہ یہ معاشرے میں مثبت

ISSN Online : 2709-4162
ISSN Print : 2709-4154
Volume.6, Issue.3 (2023)
(July-September)

تبدیلی کا پیش خیمہ ہو۔اس ضمن میں جدید افسانہ نگاروں کے ہاں یہ کوشش نظر آتی ہے کہ وہ میڈیا کی بدولت پھیلنے والی سنگین صورت حال کو اپنے افسانوں میں اس طرح جگہ دیتے ہیں جس سے ذی شعور قارئین ان مسائل کے تدارک کے لیے ان کے ہمراہ کھڑے نظر آتے ہیں۔

دورِ حاضر میں روابط انسانی ہونے کی بجائے مشینی ہو گئے ہیں۔ موبائل، انٹرنیٹ، فیس بک، ٹویٹر، انسٹا گرام وغیرہ ہمارے قابل اعتماد ذریعہ ابلاغ بن چکے ہیں۔ خط و کتابت متروک ہو چکی ہے۔ کتاب بینی کا شوق دم توڑ چکا ہے۔ تعلیمی مذاکروں کا رواج ختم ہو گیا ہے۔ معاشرتی اجتماعات میں بھی ہزاروں لوگ ایک جگہ جمع تو ہو جاتے ہیں ہیں لیکن کسی انسان کو حقیقی طور پر دیکھنے اور سننے کی بجائے ملٹی میڈیا کی بڑی رنگین سکرین سے لطف اندوز ہونے میں زیادہ فرحت محسوس کر رہے ہیں۔ روز بروز بڑھتا ہوا نسلی فاصلہ یعنی جنریشن گیپ جس شدّت اور تیزی سے بڑھ رہا ہے اس کے نتیجے میں عین ممکن ہے کہ انسان کو مستقبل قریب میں اپنے آپ سے بھی بات کا موقع نہیں ملے گا۔ سوشل میڈیا کے پروردہ نوجوان کھانے پینے کے بغیر تو چند دن گزار سکتے ہیں لیکن سمارٹ موبائل فون کے بغیر ان کا گزارا نہیں ہو سکتا۔ فیس بک، وٹس ایپ، ٹوئٹر، سنیپ چیٹ، ٹک ٹاک اور اس طرح کی ہزاروں ایپلیکیشنز ہیں جو اکیسویں صدی کے نوجوانوں کی زندگی کا لازمی حصہ ہیں۔ نوجوان نسل اپنی پچھلی نسل سے بھی اسی طرزِ زندگی کا تقاضا کرتی ہے جس کی وہ خود پروردہ ہے۔ نوجوانوں کی مصروفیات بڑھ گئی ہیں۔ اس صورتِ حال کو عرفان احمد عرفی اپنے افسانے "دیوار" میں بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ :

"۔۔۔یوں بھی ماں سے کہنے کو اس کے پاس باتیں کم پڑ گئیں۔ گھر آتا تو دامن جھاڑ کے لوٹتا، پہلے شہر کا شہر جھولی میں بھر لاتا تھا اور ماں کے سامنے ڈھیر کر دیتا تھا مگر اب ایسا نہیں تھا۔ اول تو اس کے لوٹنے کا کوئی وقت مقرر نہ تھا۔ کھانا پڑا رہ جاتا، باہر سے ہی کھا آیا، یوں لگتا جیسے وہ خود نہیں چاہتا کوئی اس کا انتظار کرے۔"(۱۳)

درج بالا حوالے سے ظاہر ہوتا ہے کہ والدین اور اولاد کا تعلق دن بدن کمزور ہوتا جا رہا ہے۔ نوجوان اپنی مصروفیت کے باعث والدین سے کسی موضوع پر بات چیت کرنا، مشورہ کرنا، ان سے رہنمائی لینا ضروری نہیں سمجھتے۔ ان کا خیال ہے کہ والدین ان کا حقِ خود ارادی سلب کر کے اپنا فیصلہ صادر کرنا چاہتے ہیں۔ دوسری طرف اکثر والدین بھی اپنی مصروفیات کے باعث بچوں کو وقت نہیں دے پاتے۔ اس طرح دو نسلوں کے درمیان ایک خطرناک کمیونی کیشن گیپ پیدا ہو رہا ہے۔ اس مسئلے کے حل کے لیے ضروری ہے کہ دونوں فریقین کے درمیان زیادہ سے زیادہ بات چیت ہو تاکہ ایک دوسرے کو اپنے اپنے موقف سے اچھی طرح آگاہ کیا جائے۔ والدین اگر بچوں کو یہ باور کروانے میں کامیاب ہو جائیں کہ وہ اپنا فیصلہ ان پر مسلط نہیں کر رہے بلکہ ان کی رہنمائی کر رہے ہیں تو یقیناً بچے کسی حد تک اپنے موقف سے پیچھے ہٹ کر والدین کی رائے کو اہمیت دیں گے۔ اسی طرح بچوں کو بھی چاہیے کہ وہ والدین کو اپنے فیصلے کی اہمیت، اس کے ساتھ جڑے جذبات، نظریات اور مستقبل کی منصوبہ بندی بارے میں والدین کو آگاہ کریں۔ اسی طرح گفت و شنید میں بحث و تکرار کی بجائے دوستانہ ماحول پیدا کرنے کی ضرورت ہے تاکہ مسائل کو بڑھانے کی بجائے ان میں کمی لائی جا سکے۔

اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ پسماندہ علاقوں میں بہتر طرزِ زندگی اور بنیادی سہولیات کا فقدان ہے جس کی وجہ سے لوگوں کی بہت بڑی تعداد بڑے شہروں کا رخ کرتی ہے۔ لیکن یہاں یہ امر بھی واضح ہے کہ یہ نقل مکانی زیادہ تر اس طبقے میں دیکھنے میں آتی ہے جہاں زمین جائیداد کی ریل پیل ہے اور اعلیٰ زمین دار طبقہ جدید سہولیاتِ زندگی کی خواہش میں نقل مکانی اختیار کرتا ہے۔ دوسری طرف یہ رجحان بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ شہروں میں سرمایہ کاری کے بھاری منافع کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اکثر دیہی زمیندار اپنے سرمائے کو شہر میں منتقل کر دیتے ہیں۔ یہ رجحان بھی صارفی معاشرت کا تحفہ ہے ورنہ ماقبل سرمایے کی اتنی فوری منتقلی عام نہ تھی۔ غیر جانبداری سے دیکھا جائے تو نقل مکانی بھی ملک کے بڑے مسائل میں ایک اہم مسئلہ ہے جس کی روک تھام کے لیئے اگر اقدامات نہ کیے گئے تو مستقبل میں بڑے شہروں میں سنگین مسائل کا سامنا ہو سکتا ہے۔ شہری زندگی پر مغربیت کے اثرات واضح ہیں۔ در حقیقت مغربی ثقافت کا ہماری ثقافت کے ہر پہلو پر اثر پڑ رہا ہے جس میں لباس، اندازِ ہائے گفتگو اور کھانے پینے کے معمولات سرِ فہرست ہیں۔ مثال کے طور پر فاسٹ فوڈز کا کلچر بڑھتا جا رہا ہے۔ روایتی اور دیسی کھانے چھوڑ کر برگر اور پیزا کھانے کا رجحان بڑھ رہا ہے اور اس نسبت سے فاسٹ فوڈ کا کاروبار بھی عروج پر ہے یہاں تک کہ اس میدان میں خواتین بھی قدم جمانے لگی ہیں۔ اس ضمن میں عرفان احمد عرفی کے افسانے "رس بھرا خواب" سے ایک جھلک ملاحظہ ہو:

ISSN Online : 2709-4162
ISSN Print : 2709-4154
Volume.6, Issue.3 (2023)
(July-September)

"۔۔۔ کبھی جہاں صرف بیسمنٹ میں اس کا ٹیک ایوے پوائنٹ تھا اب وہ اسی تین منزلہ پلازے کی واحد مالک تھی۔ اس کا پزا ہاؤس ملک بھر میں تو کیا دنیا بھر میں ہر اس کمیونٹی میں مقبول ہو چکا تھا جس کا اس شہر میں آنا جانا لگا رہتا ہے۔۔۔ ہوم ڈیلیوری، تعلقاتِ عامہ، کاروباری ترقی سے وابستہ تشہیری سرگرمیوں کا انعقاد، رسد و طلب کے مسائل، ملازمین کے پیشہ ورانہ معاملات کے علاوہ فرنچائز کی توسیع اور پھر اپنے پزا کے مخصوص برانڈ کی پراڈکٹ لائن کا بیڑا اس کی تمام صلاحیتیں اور قوتیں مانگتے تھے۔"(۱۴)

درج بالا حوالے سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہمارے معاشرے کی وہ عورت جس کی پہچان اس کے گھر میں اس کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا تھا، اب بدل رہی ہے۔ اب اس کی پہچان گھر کی چار دیواری نہیں بلکہ گھر سے باہر وہ مقام ہے جہاں وہ اپنی تمام تر صلاحیتوں کے ساتھ کھل کر سامنے آتی ہے۔ گویا عورت کا مقامی کردار معاشرے سے ختم ہوتا جا رہا ہے۔ عالمگیریت نے صرف عورت کو ہی نہیں بلکہ مرد کو بھی اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے جس کی مثال مرد کی کارپوریٹ سوچ سے لی جا سکتی ہے۔ پھر عورت کو گلیمرائز کرنے میں مرد کا بھی پورا پورا ہاتھ ہے۔ عورت ویسی ہی بن رہی ہے جیسی مرد کو مطلوب ہے۔ صارفیت اور عالمگیریت کے اس عہد میں ہمارا لباس، ہماری زبان سب کچھ مغرب زدہ ہو رہا ہے۔ ہم اپنے کلچر سے دور اور مغربی کلچر کے قریب ہو رہے ہیں۔ مغرب کے ڈرامے اور فلمیں دیکھی جا رہی ہیں اور پھر ڈراموں اور فلموں کو حقیقی زندگی میں اپنایا جا رہا ہے اس وجہ سے موجودہ نسل بے راہ روی کا شکار ہو رہی ہے۔ اس ضمن میں آرٹ انڈسٹری کی گمراہ کن تصویر کا ایک رخ عرفان احمد عرفی کے افسانے "آگے آبادی ہے" سے ملاحظہ ہو:

"۔۔۔ وہ گیلری میں رکھے گئے اس خاص تجریدی آرٹ کے نمونوں کے لیے کی گئی مخصوص سپاٹ لائٹنگ میں کسی بھی بڑی فلم انڈسٹری کی ماضی کی ایک ایسی اداکارہ دکھائی دے رہی تھی جس کا گلیمر اب بھی حیران کن ہو۔ لہورنگ کی آف شولڈر ٹاپ میں دور سے اس کے گندھے میدے جیسی صراحی دار گردن کے نیچے سینے کے نشیب میں سے جھانکتی غلیل ہر دیکھنے والے کے جسم پر پھدکتی گلہری کو نشانہ بنا رہی تھی۔۔۔ شانوں تک کٹے بالوں کو اس نے ڈرائر کے گرم جھکڑ سے سکھا پھلا کر اس قدر نمایاں کیا ہوا تھا کہ اس کا بیضوی چہرہ دور سے کسی نابالغ لڑکی کا دھوکہ دے رہا تھا۔ تیز لال مرچ کی طرح ہونٹوں پر چپکارے مارتی گلاسی لپ اسٹک گیلری کے نیم روشن ماحول میں اس کی مسکراہٹوں کے مصالحے کو اور بھی ادھر ادھر بکھیر رہی تھی۔"(۱۵)

درج بالا حوالے سے بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس قسم کے مناظر دیکھنے والے اذہان کیسا اثر قبول کر سکتے ہیں۔ ہمارے معاشرے میں مقامی لباس کو یکسر نظر انداز کر کے مغربی طرز کے پہناوے کی نہ صرف پذیرائی کی جا رہی ہے بلکہ قومی لباس کو کنارے ہی لگا دیا گیا ہے۔ مغربی زبان و لباس کی مقبولیت نے مغربی نظریات و افکار کیلئے بھی پاکستانی تہذیب و ثقافت کے دروازے کھول دیئے۔ پاکستان میں عوامی سطح پر ایسے مغربی رسم و رواج عام ہو رہے ہیں جن کا ہماری مقامی معاشرت سے کوئی تعلق نہیں۔ مثال کے طور پر معاشرے میں جینز اور شارٹ سکرٹ کا کلچر ہی دیکھ لیا جائے جس نے مقامیت کا قلع قمع کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ مقامیت کے خاتمے میں برینڈ کلچر نے بھی اہم کردار ادا کیا ہے۔ آج ہر طرف برینڈز کی بھرمار ہے۔ برینڈ کا نشہ ہر صارف کے سر میں بے طرح سمایا ہوا ہے یہاں تک کہ اگر صارف کی قوتِ خرید برینڈ کی خریداری کی اجازت نہ دے تب بھی وہ کسی نہ کسی طور اپنی تشفی کر ہی لیتا ہے۔ عرفان احمد عرفی کے افسانے "جگہ" سے اس قبیل کی ایک مثال پیش ہے:

"۔۔۔ جب وہ درآمد شدہ جین کی اترن اور انگریزی میں لکھی تحریروں سے سجی جھوٹی سچی برانڈڈ شرٹیں پہن کر گھر سے نکلتا تو دور سے دکھائی دینے والوں کو کسی معمولی سپاہی کا سپوت نظر آنے کی بجائے کینٹ میں رہنے والے کسی فوجی افسر کا لاڈلا دکھائی دیتا۔۔۔ وہ دوسروں کو بھی اسی دھوکے میں رکھنا چاہتا تھا جس خود فریبی میں خود رہنے کا عادی ہوتا جا رہا تھا۔۔۔"(۱۶)

گویا برینڈڈ کلچر خود فریبی کی مثل ہے۔ آج انسان کی پہچان اس کی شخصیت نہیں بلکہ اس کے تن پر سجا برینڈ ہے۔ انسان کی قیمت کا تعین اس کے جسم پر لدے برینڈ سے ہوتا ہے۔ عالمگیریت کے زیرِ اثر ہر چیز برینڈڈ استعمال کی جاتی ہے جس سے مغربی صنعتیں وسعت اختیار کرتی جا رہی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اپنے ملک کی چیزوں کو اہمیت نہیں دی جاتی جس سے ملکی معیشیت پر منفی اثر بڑھ رہا ہے۔ ترقی یافتہ ممالک امیر سے امیر تر ہو رہے ہیں جب کہ ترقی پذیر ممالک وہیں کھڑے ہیں۔ یہ برانڈڈ کلچر ذہنوں پر ثقافتی یلغار کا ایسا ہتھیار

ISSN Online : 2709-4162
ISSN Print : 2709-4154
Volume.6, Issue.3 (2023)
(July-September)

ہے جس سے ہر شخص متاثر ہو رہا ہے۔ اور تو اور بچوں میں مغربی کارٹون اور کھلونوں کی ایسی سوچ پروان چڑھائی جا رہی ہے کہ وہ اپنے روایتی کھلونوں کو قدر کی نگاہ سے نہیں دیکھتے۔ مغربی اقدار و روایات کا فروغ بچوں میں اس انداز سے پا رہا ہے کہ وہ نشو و نما کے دوران ہی کب مغربی ثقافت و کلچر ڈھلتے ہیں اس کا پتہ بھی نہیں چلتا۔ یہ روایات میڈیا کے ذریعے سے اس قدر وسعت اختیار کر گئی ہیں کہ گلوبلنگ معاشرہ تشکیل پا رہا ہے۔ بچوں کے ذہنوں پر مغربی ثقافت اور اقدار اس قدر اثر انداز ہو رہی ہیں کہ وہ اپنی تہذیب سے دوری اختیار کرتے جا رہے ہیں۔ ایسے میں معاشرے سے مقامی اقدار اور روایات کا خاتمہ زور پکڑ رہا ہے۔ اردو افسانے میں مقامیت کے اس خاتمے اور انہدام کو موضوع بنا کر قارئین کو اس اہم مسئلے سے آگاہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور ضمن میں ادیب اور قاری دونوں کی ذمہ داری ہے کہ معاشرے سے ناپید ہوتی ہوئی مقامیت کے استحکام کے لیے ہر ممکن اقدامات اپنائے جائیں۔

حوالہ جات

۱۔https://www.sabkidunya.com

۲۔ عرفان احمد عرفی، پاؤں، دستاویز مطبوعات، لاہور، اشاعت دوم، ۲۰۱۸ء، ص: ۱۵

۳۔ ایضاً، ص: ۳۷

۴۔ عرفان احمد عرفی، کنٹرول روم، سانجھ پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۷ء، ص: ۵۳

۵۔ عرفان احمد عرفی، پاؤں، ص: ۴۹-۵۱

۶۔ ایضاً، ص: ۳۷

۷۔ ایضاً، ص: ۴۷

۸۔ ایضاً، ص: ۵۸

۹۔https://web.facebook.com/Urdunews/posts

۱۰۔ عرفان احمد عرفی، پاؤں، ص: ۳۷

۱۱۔https://web.facebook.com

۱۲۔ https://www.humsub.com.pk

۱۳۔ عرفان احمد عرفی، کنٹرول روم، ص: ۳۷

۱۴۔ عرفان احمد عرفی، پاؤں، ص: ۵۲

۱۵۔ عرفان احمد عرفی، پاؤں، محولہ بالا، ص: ۵۲

۱۶۔ عرفان احمد عرفی، پاؤں، محولہ بالا، ص: ۷۶